ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

# رومی کی چند تشبیہات



عقل اور وجدانِ حیات میں کیا فرق ہے اس کی بابت زمانہ حال میں حکیم برگساں نے بڑی تحقیق اور نکتہ آفرینی سے ایک فلسفے کی تعمیر کی ہے۔ علامہ اقبال بھی اس کے مداح اور اس سے متاثر تھے۔ برگساں کے اساسی عقائد اور عارفِ رومی کے افکار میں اس بارے میں بے حد مماثلت پائی جاتی ہے۔ اگرچہ ہماری رائے ہے کہ عارف رومی کو ان حقائق کے متعلق علم الیقین کے علاوہ عین الیقین اور حق الیقین بھی حاصل ہے۔ بہرحال علمی سطح پر دونو ایک ہی قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ برگساں کہتا ہے کہ عقل استدلالی جو استخراج اور استقرا سے کام لیتی ہے اس کا کام اس مادی عالم میں جسمانی افادیت ہے۔ خارجی فطرت کا فہم اور حیاتیات کے اغراض کے لئے اس کی تسخیر وجدان کی تنویر سے الگ چیز ہے برگساں نے اپنی آخری کتاب میں جو اس نے مذہب اور اخلاق پر لکھی ہے اس کا اقرار کیا ہے کہ وجدانِ حیات جسے عشق کہنا چاہیئے وہ انبیاء اور اولیا میں پایا جاتا ہے اسی لئے ان کی اخلاقیات عام قبیلوی اور قومی پیکارِ حیات سے ماخوذ نہیں ہوتی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ عقل خواہ کتنی حکیمانہ ہو جائے۔ ذرّوں کا دل چیرے یا فلک پیمائی کرے۔ اپنی اصلیت میں مادی عالم سے توافق پیدا کرنے کا کام کرتی ہے۔ اس سے ماورئ وجدانِ حیات ہے جو نہ مکانی ہے اور نہ زمانی۔ اس کے اندر جو زمان ہے اس کو ماضی حال اور مستقبل کی تقسیم سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ ایک تخلیقی میلان اور سیلان ہے مولانا روم اس افادی عقل کو کبھی عقل جزوی کہتے ہیں اور کبھی عقلِ حیلہ جو۔ اس عقل سے جو علم پیدا ہوتا ہے وہ بہت محدود ہوتا ہے اور نوعِ انسان عام طور پر اس کو بے تحقیق تقلیداً اخذ کرتی رہتی ہے۔ نوع کا مجموعی تجربہ عام انسانوں کا ورثہ بن جاتا ہے۔ حکیمانہ تحقیق کے نتائج تقلیداً عام ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ایسے علم کو مولانا علم تقلیدی کہتے ہیں ایک دلچسپ تجنیس میں عقل موسوی اور عقل موشی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ہماری جزوی اور مادہ آلودہ عقل کا کام چوہے کا کام ہے جو خاک سے گہرا تعلق رکھتا ہے اور افلاک سے بھی واسطہ نہیں رکھتا۔ فرماتے ہیں کہ میں اس کو چوہا اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اس عقل کی جائے معاش یہی عالم خاکی ہے۔ زمین کھود کر کاشتکاری کرنا زمین کی اتھاہ گہرائیوں میں کانیں کھود کر زر و جواہر اور دیگر ضروری مواد نکالنا، غرضیکہ ہر طرح سے معاشی سطح کو بلند کرنا اس کا مقصود ہوتا ہے۔ اب تو مغربی ممالک میں انسان واقعی چوہوں کا کام کر رہا ہے۔ ہر بڑے شہر میں زیرِ زمین ہزاروں میلوں کی سرنگیں بنا ڈالی ہیں۔ یہ عقل

یہاں خرید و فروخت کے کام آتی ہے لیکن اللہ کے ساتھ کوئی سودا نہیں کر سکتی۔ غیب کا وجدان تو ایسی نادر چیز ہے کہ خضر کے مقابلے میں موسیٰ کے لئے بھی اوّل مرحلہ میں قابلِ فہم نہیں ہوتی، چہ جائیکہ کسی موش کی سمجھ میں آسکے :

عقلِ موسیٰ چوں بود در غیب بند　　عقلِ موشے چوں بود اے ارجمند
علمِ تقلیدی بود بہر فروخت　　چوں بیابد مشتری خوش بر فروخت

---

موش گفتم زانکہ در خاک است جاش　　خاک باشد موش را جائے معاش
راہ ہا داند ولے در زیر خاک　　ہر طرف او خاک را کردہ است چاک

---

زیرِ زمین سرنگیں کھود کر ریلیں چلانا۔ میلوں تک زمین اور پہاڑ کھود کر پٹرول نکالنا۔ بڑے شہروں کی سڑکوں کو کھود کر کہیں ٹیلیفون کے کیبل کہیں پانی کے نل، کہیں گیس کے پائپ غرضیکہ سائنس جتنی ترقی کر رہی ہے زمین کا سینہ چاک ہو رہا ہے۔ اب مادی ذرات کا سینہ چیر کر ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم اس لئے بنائے ہیں کہ دنیا کے مادی وسائل پر قبضہ کرنے کے لئے جنگ میں ذریعۂ فتح بن سکیں۔ خاک کو اس طرح چاک کرنے سے کوئی روحانی اور اخلاقی غرض حاصل نہیں ہوتی۔ ہاں ذرائع معاش بڑھ جاتے ہیں اور یہی بات مولانا بھی کہہ رہے ہیں کہ چوہے کو بقدرِ حاجت سرنگیں لگانے اور ان کے اندر رزق کی چوری یا ذخیرہ اندوزی کی عقل دی گئی ہے۔ جن انسانوں کی عقل اس سے بلند نہیں ہو سکی ان کو بھی چوہے ہی سمجھو۔ انسان جب اس سے بلند حکمت کا طالب ہوگا تو عقلِ موسوی تک پہنچ جائیگا۔ اللہ کے ہاں بھی طلب اور رسد کا قانون ہے :

نفسِ موشے نیست الا لقمہ اند　　قدرِ حاجت موش را جستے دہند

---

آنکہ بے حاجت خداوندِ عزیز　　می نہ بخشد ہیچ کس را ہیچ چیز

---

عصرِ جدید میں نظریہ ارتقائے حیات کو پیش کرنے والے بعض حکماء یہ کہتے ہیں کہ تمام حیوانات نے ادنےٰ ترین حشرات سے ترقی پا کر گوناگوں شکلیں اور اعضاء پیدا کئے ہیں۔ ڈارون کے نزدیک یہ ترقی میکانکی اور اتفاقی تھی لیکن اس کے مخالف رائے رکھنے والے کہتے ہیں کہ جانداروں میں اختلافِ ماحول سے زندہ رہنے کے لئے مختلف قسم کی حاجتیں پیدا ہوئیں اور ان حاجتوں نے ان کے اعضاء میں مناسب تبدیلی پیدا کر دی۔ زندگی ہر جگہ ارتقاء طلب ہے اس میں تغیرات محض میکانکی یعنی بے مقصود پیدا نہیں ہوتے۔ جس چیز کی طلب اور حاجت شدید ہو جاتی ہے۔ فطرت

اس کے مطابق حیوان کے عضوی وجود میں مناسب تبدیلی پیدا کر دیتی ہے۔ ذوقِ حیات کے اندر خلاقی موجود ہے۔ علامہ اقبال بھی اسی نظریہ کو صحیح سمجھتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

کیک پا از شوخیٔ رفتار یافت　　بلبل از ذوقِ نوا منقار یافت

عارفِ رومی بھی ارتقائی فلسفی ہیں اور اپنے نظریہ کو طرح طرح سے پیش کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ خدا نے جی زمین و آسمان میں جو کچھ خلق کیا ہے وہ کسی حاجت ہی سے کیا ہے۔ ایک انگریزی محاورے کا ترجمہ ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ یہ قانون تمام ہستی میں پایا جاتا ہے :

گر نبودے حاجتِ عالم، زمیں　　ما فریدے ہیچ رب العالمین
ور نبودے حاجتِ افلاک ہم　　ہفت گردوں ما وریدے از عدم
پس کمندِ ہست ہا حاجت بود　　قدرِ حاجت مرد را آلت بود
پس چو حاجت شد کمند ہست ہا　　قدرِ حاجت می رسد از حق عطا

اس سے نتیجہ یہ اخذ کرتے ہیں کہ مدارجِ حیات میں اگر اور ترقی کرنا چاہتے ہو تو بلند تر حاجتیں پیدا کرو جو فکرِ معاش نہ ہوں کیونکہ یہ حاجت تو چوہے میں بھی موجود ہے :

پس بعیر احاجت اے محتاج زرد　　تا بجوشد از کرم دریائے جود

فرماتے ہیں کہ زمین کے اندر ایسے بھی حشرات ہیں جن کی آنکھیں نہیں ہیں۔ ان کی محدود حاجت بے بصارت ہی پوری ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی رزق کی چوری کے لئے سطحِ زمین پر بھی آجاتا ہے :

میتواند زیست بے چشم و بصر　　فارغ است از چشم اندر خاک تر

اگر اسی زمین کے اندر رہنے والے بے بصر جاندار میں فضائی کشادگی اور روشنی کی ضرورت پیدا ہو جائے تو ترقی کر کے اسی کے بال و پر نکل آئیں اور یہ بھی فرشتوں کی طرح فلک پرواز بن جائے :

بعد ازاں پر یابد و مرغے شود　　چوں ملائک جانبِ گردوں رود
سرزماں در گلشنِ شکرِ خدا　　او برآرد ہمچو بلبل صد نوا

---

عصرِ جدید کے اکابر فلاسفہ اور ماہرینِ نفسیات میں امریکی ولیم جیمز بلند پایہ مفکر و محقق شمار ہوتے ہیں۔ علم النفس میں ان کی تصانیف نہایت بلند پایہ ہیں۔ برطانوی ماہرینِ علم النفس کے نظریہ کے خلاف انہوں نے فکر کو ایک جوئے رواں سے تشبیہ دی جو مسلسل بے شکست موج پر موج چلی جا رہی ہے۔ مختلف نفسی کیفیات کوئی عناصرِ احساسات و افکار کے مرکبات نہیں ہوتے۔ جوئے رواں کے تصور سے انہوں نے بہت سے نفسیاتی نتائج

اخذ کئے ہیں جو عناصر اور ان کی ترکیب سے اخذ نہ ہو سکتے تھے۔ اس بارے میں عارفِ رومی ولیم جیمز کا پیش رو ہے۔ شعورِ انسانی کا تصوّر اس کے ہاں بھی جوئے رواں ہی کا تصوّر ہے۔ فرماتے ہیں کہ :

جسم جوئے و روح آبِ سائر است

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ جوئے فکر کوئی فکرِ خالص کا بہاؤ نہیں۔ اس میں طرح طرح کے اچھے اور بُرے خس و خاشاک تیرتے چلے آتے ہیں۔ شعور کی کسی کیفیّت کو ساکن سمجھنے والے اس کے متعلق دھوکے میں ہیں۔ بعض اوقات کوئی ندی تموّج کے بغیر رواں ہوتی ہے لیکن دیکھنے والے کو ساکن دکھائی دیتی ہے۔ اس کی روانی کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ پہلے تنکے بہ کر آگے جا رہے ہیں اور دوسرے تنکے نو بنو چلے آ رہے ہیں۔ اسی طرح ہر لمحہ نئے فکر کا پیش شعور آنا ثابت کرتا ہے کہ جوئے شعور ساکن نہیں ہے بلکہ بہ رہی ہے :

در روائی جوئے آبِ جوئے فکر — نیست بے خاشاکِ خوب و زشتِ ذکر
او روان است و تو گوئی واقف است — او دوان است و تو گوئی عاکف است
گر نبودے سیرِ آب از جا بجا — چیست بروئے نو بنو خاشاک ہا
ہست آں خاشاک صورتہائے فکر — نو بنو در می رسد اشکالِ بکر

---

اس کے بعد اس عام نفسیاتی نظریہ سے روحانیت کی طرف عبور کرتے ہیں کہ بعض افکار جو جوئے شعور کی سطح پر تیرتے نظر آتے ہیں وہ غیب کی طرف سے اشارے ہوتے ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھ لو کہ ایک ندی گلزار و کشف زار سے ہوتی ہوئی تمہارے گھر کے سامنے بہ رہی ہے۔ بعض میووں اور ترکاریوں کے چھلکے اس کا پتہ دے رہے کہ یہ چشمہ میدان میں سے نہیں باغ میں سے آ رہی ہے۔ اب اگر تمہیں ان میووں کے کھانے کا شوق پیدا ہو جن کے چھلکوں کو تیرتے ہوئے تم نے دیکھا ہے تو تمہیں اس طرف نہر کے کنارے چلنا چاہئے جدھر سے وہ آ رہی ہے۔ اس سراغ سے تم باغ تک پہنچ جاؤ گے یہی حال بعض روحانی افکار کا ہے جن کے متعلق انسان محسوس کرتا ہے :

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں — غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے
قشرہا بر روئے ایں آبِ رواں — از شمارِ باغِ غیبی شد رواں
قشرہا را مغز اندر باغ جو — زانکہ آب از باغ می آید بجو
گر نہ بینی رفتنِ آبِ حیات — بنگر اندر جوئے ایں سیرِ نبات

فرماتے ہیں کہ عارفوں کے شعور میں اس آبِ حیات کی روانی بکثرت اور بسرعت ہوتی ہے اس لئے اگر کوئی غم انگیز فکر شعور میں ابھر آئے تو جلدی سے گزر جاتا ہے اور ان کی روح میں ڈیرہ نہیں ڈال دیتا :

آب جو آنیہ تر آید در گذر — زودکند قشرِ صور زو تر گذر
چو بغایت تیز این جو رواں — غم نیاید در ضمیرِ عارفاں

دمے باغم بسر بُردن جہاں یکسر نمی آرزد۔ حافظ
بیار بادہ کہ ایامِ غم نہ خواہد ماند — جہاں نہ ماند چنیں تیز ہم نخواہد ماند۔ حافظ

---

فرماتے ہیں کہ انبیاء اولیاء بھی دلائل سے کام لیتے ہیں۔ لوگوں سے مناظرہ اور مباحثہ بھی کرتے ہیں۔ اگرچہ بطریقِ احسن بحث کرتے ہیں۔ مخاطب کو ہرانا اور ذلیل کرنا مقصود نہیں ہوتا جیسا کہ عام طور پر مناظروں کا قاعدہ ہے۔ روحانیات میں عقلی دلیل روحانی تجربے کے مقابلے میں ضعیف ہوتی ہے لیکن اس ضعف کے باوجود اس سے کام لینا عام افہام کے لئے ناگزیر ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ دلیل سے رہنمائی ایسے رہرو کے لئے ہوتی ہے جس کے متعلق ہر وقت بیابان میں راستہ گم کرنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ جو شخص منزل رسیدہ اور واصل بحق ہے اس کے لئے تو اس اپنی بصیرت چشم و چراغ ہے لیکن عام لوگوں سے مردِ عارف بتنزّل بات کرتا ہے ان کو سمجھانے کے لئے ان کی سطح پر اُتر آنا لازم ہوتا ہے۔

ایک باپ جو خود فصیح البیان شخص ہے الفاظ کا صحیح تلفّظ جانتا ہے۔ اس کی عقل فلک پیما ہے لیکن ایک دو برس کے بچے سے باتیں کرتے ہوئے بچّے کی طرح تتلا کر بولنے لگتا ہے وہ جانتا ہے کہ صحیح بولی یہ نہیں مگر ابتدائی عمر میں بچے سے اسی طرح بولنا صحیح سمجھتا ہے۔ الف بے شروع کراتے ہوئے ابجد خوان بچّے کو معلم بتاتا ہے کہ الف خالی ہے حالانکہ الف میں بہت کچھ ہے۔ مگر اس منزل میں بچّے کو محض نقطوں کے متعلق تعلیم دیتا ہے اس لئے الف کو خالی کہہ دیتا ہے۔ انبیاء کا طریقِ تعلیم بھی یہی ہے۔ وہ عوام کے لئے ایسا طرزِ بیان اختیار کرتے ہیں جو صاحبِ حکمت و عرفان کو طفلانہ معلوم ہوتا ہے مگر اللہ کی طرف سے انبیاء کو یہی حکم ہے کہ لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق بات کیا کرو۔ روحانی حقائق کے معاملے میں اکثر لوگ اطفال ہی ہیں لہٰذا اکثریت کے لئے اب بھی یہی طرزِ بیان مناسب ہے۔ حکماء اور عرفا اگر وہ اپنے مناسب معلوم نہ ہو تو ان کو معترض نہیں ہونا چاہئے:

ایں دلیلِ راہ رہرو را بود — کو بہردم در بیاباں گم شود
واصلاں را نیست جز چشم و چراغ — از دلیل و راہ شاں باشد فراغ
گر دلیلے گفت آں مردِ وصال — گفت بہرِ فہمِ اصحابِ جدال

---

بہرِ طفلِ نو پدر تی تی کند — گرچہ عقلش ہندسہ گیتی کند

کم نگردد فضلِ استاد از عُلُوّ  گر الف چیزے ندارد گوید او
از پئے تعلیم آں بستہ دہن  از زبانِ خود بروں باید شدن
در زبانِ او بباید آمدن  تا بیاموزد زتو او علم و فن
پس ہمہ خلقاں چو طفلاں وے اند
لازم است ایں پیر را در وقت پند

---

احیاء العلوم میں امام غزالیؒ نے ایک حدیث بیان کی ہے:

نحن معاشر الانبیاء امرنا ان ننزل الناس منازلہم ونکلمھم علی قدر عقولھم

ہم پیغمبر لوگوں کو حکم ہے کہ لوگوں سے ان کے حسب مراتب سلوک کریں اور ان کی عقلوں کے مطابق ان سے بات چیت کیا کریں۔

---

اللہ تعالیٰ نے جو اخلاقی پستی میں گرے ہوئے انسانوں کو جانوروں سے بدتر کہا ہے اس کا ثبوت ہر انسان کو عام مشاہدے سے مل سکتا ہے۔ ہر حیوان اپنی فطری خواہشوں اور ضرورتوں کو اپنی معینہ فطرت کے مطابق پورا کرتا ہے۔ کھانا پینا، جنسی جذبہ، میلانِ تناسل سب کے قواعد مقرر ہیں۔ کوئی حیوان غلط غذا پر منہ نہیں ڈالتا دیگر شہوات کا بھی یہی حال ہے مگر حضرتِ انسان ہیں کہ ہر غیر فطری طریقے کی طرف بشدت مائل ہیں۔ غیر فطری زندگی عادت سے ان کے لئے فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ گدھے کو انسان بے عقل سمجھتے ہیں لیکن مبتلائے معاصی گدھے سے زیادہ بے عقل ہوتا ہے۔ گدھا اگر کسی دلدل میں پھنس جائے یا کیچڑ میں گر جائے تو اُٹھنے کے ارادے سے دمبدم حرکت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ٹھوس زمین میں اس کے قدم جم جائیں۔ کبھی یہ کوشش نہیں کرتا کہ اپنے جسم سے اسی کیچڑ کو ہموار کر کے اس میں بیٹھ جاؤں لیکن انسان جب اخلاقی کیچڑ میں دھنستا ہے تو اس کا جی چاہتا ہے کہ اسی کو ہموار کر کے یہیں ڈیرہ ڈال دوں۔ اگر ابلیسانہ زیرکی سے تاویل باز اس قدر ہے کہ اگر کہو کہ بھائی اس دلدل سے نکلو کہاں جم کر بیٹھ گئے ہو تو کہتا ہے کہ یہ ایک اضطراری حرکت ہے مجبوری اور معذوری میں خدا نے حرام کو بھی حلال و مباح کر رکھا ہے ہماری اس کیفیت کو گناہ نہ سمجھو کبھی اضطرار میں پناہ لیتا ہے اور کبھی اپنے عمل کو قضا کے ذمے تھوپتا ہے:

در کوئے نیک نامی ما را گزر نہ دادند  گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

اب بتاؤ کہ یہ گدھے سے بدتر ہوا یا نہیں جو کوشش سے کیچڑ میں سے نکل کر پائدار خشک زمین پر جمنا چاہتا ہے:

چوں فرس در گل فتاد از گام تیز  دمبدم جنبد برائے عزم خیز
جائے را ہموار نکند بہر باش  داند او کہ نیست آں جائے معاش

حق تو از حق خرکم تر بُدست　　　　کہ دل توزاں ولدل ہا برنجست
در وصل تاویلِ رخصت می کنی　　　　چوں نمی خواہی کزاں دل برکنی
کیں روا باشد مرا من مضطرم　　　　حق نگیرد عاجزے را از کرم

---

کبھی خدا کو رحیم و کریم کہہ کر، کبھی قضا و قدر سے مجبوری کا عقیدہ پیش کرکے کبھی اضطرار سے رخصت پاکر اپنے آپ کو خدا کی گرفت اور اعمال کی پاداش سے محفوظ و مصئون سمجھ لیتا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ یہ تمام عذرِ لنگ اس کو اور زیادہ گرفتار کئے جاتے ہیں۔

بجّو کے متعلق شکاریوں نے ایک قصّہ مشہور کر رکھا ہے رہے تو بے اصل لیکن تمثیل کے لئے کام آسکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ شکاری جب اسے پکڑتے جاتے ہیں تو اس کے بل کے سامنے جھوٹ موٹ ایک مکالمہ شروع کرتے ہیں۔ ایک بولتا ہے کہ ارے بجّو تو یہاں نہیں ہے۔ دوسرا جواب دیتا ہے کہ کہیں اِدھر اُدھر پانی پینے گیا ہوگا۔ تیسرا کہتا ہے کہ چلو پھر اس کو ڈھونڈیں۔ بجّو یہ تمام گفتگو سُن رہا ہوتا ہے۔ اب وہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ میرے یہاں اس بل میں ہونے کا ان کو علم نہیں، آنکھیں بند کرکے مست ہو کر وہیں ٹکا رہتا ہے کہیں بھاگنے کی کوشش نہیں کرتا۔ تو شکاری اس کو آسانی سے جال میں پھنسا لیتے ہیں۔ جب پکڑا جاتا ہے تو دھوکا کھانے پر پشیمان ہوتا ہے لیکن جب پکڑا گیا تو پھر پشیمانی سے کیا حاصل۔ گناہ کرنے والے انسانوں کا بھی یہی حال ہے۔ نفس امارہ کا یہ جھوٹا مکالمہ سُن کر گیرودار اور کیفر کردار سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ یک بیک عذابِ الٰہی میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

جھوٹے اطمینان سے گنہ گاری کو جاری رکھنے کی ایک بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ عاصی کہتا ہے کہ بھائی خدا بڑا کریم ہے ہم نے اتنے گناہ اور جرم کئے لیکن اس نے ہمیں ازراہِ کرم آج تک نہیں پکڑا۔ انشاء اللہ آئندہ بھی ہمارے بارے اس کی شانِ کریمی عمل میں آتی رہے گی :

عصیاں سے کبھی ہم نے کنارا نہ کیا　　　　پر تو نے دل آزردہ ہمارا نہ کیا
ہم نے تو جہنم کی بہت کی تدبیر　　　　لیکن تیری رحمت نے گوارا نہ کیا

مولانا فرماتے ہیں کہ حضرت شعیبؑ کے زمانے میں ایک شخص تھا وہ اسی قسم کے فریبِ نفس میں مبتلا تھا حضرت شعیبؑ سے کہنے لگا کہ ہم نے بہت گناہ کئے لیکن خدا نے ہم کو نہیں پکڑا یہ اس کی شانِ کریمی ہے :

آں یکے می گفت در عہدِ شعیب　　　　کہ خدا از من بسے دیدست عیب
چند دید از من گناہ و جُرم ہا　　　　واز کرم یزداں نمی گیرد مرا

اللہ تعالےٰ نے حضرت شعیب کو وحی کی کہ اس نالائق فریب خوردہ شخص کو کہہ دو کہ عمل کی پاداش سے

نہ کوئی دنیا میں بچ سکتا ہے اور نہ آخرت میں۔ ہر عمل بحیثیتِ سبب اپنا اثر ضرور پیدا کرتا ہے لیکن بصیرت کے اندھوں کو وہ دکھائی نہیں دیتا:

از مکافاتِ عمل غافل مشو　　گندم از گندم بروید جو ز جو

بارہا دیکھا ہے اس دارِ مکافات میں میر　　اینٹ اُٹھانے بھی نہ پائے تھے کہ پتھر آیا

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے (نظیر اکبر آبادی)

چنانچہ حضرت شعیب نے القائے ربانی سے اس گم کردہ راہ کو یہ جواب دیا کہ اے سیدھا راستہ چھوڑ کر بیابانِ پُرخطر کا رُخ کرنے والے تو اپنی حالت کو بالکل برعکس سمجھ رہا ہے۔ تو چھوٹا ہُوا نہیں ہے بلکہ از سر تا پا زنجیروں میں جکڑا ہُوا ہے۔ یہ زنجیر پا اور طوق بہ گردن تجھے دکھائی نہیں دیتا۔ پاداشِ عمل کو خدا نے آخرت پر ہی نہیں ملتوی رکھا۔ انسان کی اصلیت جسم نہیں بلکہ روح و قلب ہے۔ تیرے دل پر سیاہی کی کئی تہیں جم چکی ہیں اور تیرا دل دیگ کا تلا بن گیا ہے۔ تیرے آئینۂ قلب پر اس کثرت سے زنگار جمع ہو گیا ہے کہ اس میں اب کوئی حقیقت منعکس نہیں ہو سکتی:

عکس می گوئی و مقلوب اے سفیہ　　اے رہا کردہ رہ و بگرفتہ تیہ

چند چندت گیرم و تو بے خبر　　در سلاسل ماندۂ پا تا بسر

زنگ تو بر توت اے دیگ سیاہ　　کرد سیمائے درونت را تباہ

بر دلت انگار بر زنگار ہا　　جمع شد تا کور شد اسرار ہا

کلّا بل ران علٰی قلوبھم ما کانوا یکسبون۔　　ہرگز نہیں بلکہ ان گناہوں نے جن کے وہ مرتکب ہوئے ہیں ان کے دلوں پر زنگار چڑھا دیا ہے (سورہ تطفیف)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ کریم نے فرمایا کہ مومن جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے۔ توبہ اور استغفار سے وہ صاف ہو جاتا ہے لیکن اگر گناہ کرتا چلا جائے تو یہ نقطہ پھیلتا پھیلتا اس کے تمام قلب پر زنگ لگا دیتا ہے۔

اس کے بعد دیگ کی سیاہی کی مثال کو توسیع دیتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں کہ اگر نئی سفید چمکدار دیگ ہو تو اس کے اوپر جو برابر بھی سیاہی نمایاں ہو جائے گی لیکن خوب دھواں کھا کر دیگ کے تلے پر سیاہی کی کئی تہیں جم جائیں تو اس کے بعد مزید دھواں اس کی سیاہی میں کچھ اضافہ کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ یہی حال انسان کی گنہگاری کا ہے جب ایک شریف آدمی سے کوئی لغزش ہوتی ہے تو عصیاں کا ذرا سا نقطۂ سیاہ بھی اس کو اپنے آئینہ میں نظر آنے لگتا ہے وہ اس سے پریشان اور پشیمان ہوتا ہے۔ لیکن اگر باز نہ آئے اور گناہ پر گناہ کرتا چلا جائے تو کثرتِ گناہ اس کے آئینۂ قلب پر نہ نمودار ہوتی ہے اور نہ اس کو توبہ و استغفار کی طرف لاتی ہے۔ اب وہ زنگ آ

آئینہ اور دیگ سیاہ بن گیا ہے :

گر زند آں رود بر دیگ توے — آں اثر بنماید ار باشد جوئے
زانکہ بر ضدے بضد پیدا شود — بر سفیدی آں سیاہ رسوا شود
چوں سیہ شد دیگ از تاثیر رود — بعد ازاں بروے کہ بیند دود زود

---

اسی مضمون کو اور واضح کرنے کے لئے مولانا کو ایک اور تشبیہ سوجھتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک شخص حبشی ہو اور لوہار کا پیشہ کرتا ہو تو بھٹی کے دھوئیں کا کوئی اثر اس کے چہرے پر دکھائی نہ دیگا لیکن سفید فام آدمی جب لوہار کا کام کرتا ہے تو فوراً دھوئیں کے داغ اس پر نمایاں ہو جاتے ہیں اور وہ ابلق یعنی داغدار دکھائی دینے لگتا ہے :

مردِ آہنگر کہ او زنگی بود — دود را با روش ہم رنگی بود
مردِ رومی گر کند آہنگری — رویش ابلق گردد از دود آذری

نو گرفتارِ گناہ تو فوراً توبہ کرنے لگتا ہے لیکن گناہ پر اصرار کرنے اور اس پر قائم رہنے والی کی چشمِ بصیرت میں مٹی پڑ جاتی ہے۔ عادت سے گناہ اس کے لئے پہلے قابلِ برداشت اور آخر میں گوارا و شیریں ہو جاتا ہے :

آں تلخ وش کہ ساقی اُم الخبائث خواند — اشہی لنا واحلی من قبلۃ العذارا

تازہ گنہ گار تو :

پس بداند زود تاثیرِ گناہ — پس بنالد زار گوید گائے اللہ

لیکن پکا عاصی :

چوں کند اصرار و بدپیشہ کند — خاک اندر چشم اندیشہ کند
توبہ ندہد بعد، دگر شیریں شود — بر ویش آں جرم تا لے دیں شود

---

از روئے تجربہ اور بر بنائے علم النفس بات اس قدر سچی ہے کہ مولانا کے ذہن میں تشبیہ پر تشبیہ وارد ہوتی ہے۔ مومن کے قلبِ معصوم کو ایک سفید کاغذ سمجھ لو۔ انسان کا نامۂ اعمال کسی مادی قرطاس پر تو مرقوم نہیں ہوتا جو کچھ تحریر ہوتا ہے وہ قلب ہی پر ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ سفید کاغذ پر اگر کوئی تحریر سیاہی سے ثبت ہو تو اچھی طرح پڑھی جائیگی اور صاف نظر آئے گی لیکن لکھے ہوئے کاغذ پر کچھ اور لکھا جائے گا تو نہ پہلی تحریر پڑھی جائیگی اور نہ دوسری دونوں کا مطلب خبط ہو جائے گا۔ تیسری اور چوتھی بار اور بار بار بھی اگر اسی پر لکھتے چلے جائیں تو الفاظ ایک دوسرے کو کاٹتے چلے جائیں گے اور پڑھنے والا کچھ نہ سمجھ سکے گا۔ گنہ گاری کا بھی یہی حال ہے نامۂ اعمال پر تھوڑی سی تحریر سیہ کاری تو

فوراً محسوس ہوتی ہے لیکن گناہگاری کے اصرار میں تحریر پر تحریر اور سیاہی پر سیاہی خود مردِ عاصی کے لئے بے معنی ہو جاتی ہے اب وہ گناہ کا کچھ مطلب ہی نہیں سمجھ سکتا اس لئے خیال کرنے لگتا ہے کہ میں کوئی گناہ نہیں کر رہا۔

چوں نویسی کاغذِ اسپید پر — آں نوشتہ خواندہ آید در نظر
چوں نویسی برسرِ بنوشتہ خط — فہم ناید خواندنش گردد غلط
کاں سیاہی برسیاہی اوفتاد — ہر دو خط شد کور، معنی او نداد
ور سوم بارہ نویسی بر مرش — بس سیہ کردی چو جانِ کافرش

---

اُس فریب خوردہ عاصی کا سوال و جواب حضرت شعیبؑ سے جاری رکھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ گنہ گار پوچھنے لگا کہ آخر مجھ کو کس طرح معلوم ہو کہ گناہ سے میرا باطن سیاہ ہو گیا ہے اور یہ سیاہئ قلب ہی شدید سزا ہے جو خارج سے نہیں بلکہ عمل کے اندر ہی سے پیدا ہوتی ہے اس پر حضرت شعیبؑ کو خدا کی جانب سے یہ القاء ہوا کہ اس سے کہو کہ خدا ستار پردہ پوش ہے تمہاری بداعمالیوں کو سب پر فاش کرنا نہیں چاہتا لیکن روحانی محرومی کی ایک نشانی خود تمہاری ہدایت کے لئے بتائے دیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جب گنہ گاری دل کی رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے تو اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے شخص کی عبادت ذوق سے محروم ہو جاتی ہے۔ لوگوں کی دیکھا دیکھی یا دکھاوے کے لئے نمازیں پڑھتا ہے لیکن اس کی نماز بے حضور محض جنبشِ اعضا ہوتی ہے۔ روزے رکھتا ہے لیکن چونکہ تقوے ان کے ساتھ وابستہ نہیں اس لئے اس کے روزہ محض بھوک اور پیاس کی لاحاصل تکلیف ہے۔ زکوٰۃ بھی دیتا ہے لیکن طبیعت پر جبر کر کے۔ بظاہر اس کے اعمال اچھے بھی دکھائی دیں لیکن حسنِ نیت سے خالی ہونے کی وجہ سے بے مغز کے چھلکے ہی ہوتے ہیں۔ وہ شخص حبطت اعمالھم کا مصداق ہوتا ہے۔ روحانی زندگی تو ذوقِ قلب کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور گنہ گاری انسان کو اس ذوق سے محروم کر دیتی ہے۔ اعمال کی صورت موجود ہوتی ہے لیکن ان کے معنی ناپید ہوتے ہیں۔ ایسا شخص اعمال کے چھلکے بو رہا ہے۔ بھلا کوئی شخص محض چھلکوں سے کوئی درخت اُگا سکتا ہے؟ بیج میں مغز نہ ہو تو زمین میں مُردے کی طرح مدفون ہی رہے گا۔ جزائے خیر کے برگ و ثمر پیدا نہ کر سکیگا:

حضرت شعیبؑ فرماتے ہیں یا رب یہ گرفتاری اور سیہ کاری کا نشان طلب کرتا ہے۔ خدا نے کہا کہ میں ستارِ عیوب ہوں اس کے نامۂ اعمال کو فاش کرنا نہیں چاہتا لیکن اس سے کہو کہ محرومی کی اس نشانی پر غور کر کے اپنے گریبان میں مُنہ ڈال کر دیکھ لے:

یک نشانے آنکہ می گیرم ورا — آنکہ طاعت دارد و صوم و دُعا
از نماز و از زکوٰۃ و غیر آں — لیک یک ذرّہ ندارد ذوقِ جاں

می کند طاعات وافعال سنی | لیک یک ذرّہ ندارد چاشنی
طاعتش نغز است ومعنی نغز نے | جوزہا بسیار و در وے مغز نے
ذوق باید تا دہد طاعات بر | مغز باید تا دہد دانہ شجر
دانۂ بے مغز کے گردد نہال | صورتِ بے حال نہ باشد جز خیال

---

زوال یافتہ ملّتوں میں زیادہ تر انسانوں کے اعمال و اخلاق پست اور رذیل ہو جاتے ہیں لیکن چند مردانِ خدا سے کوئی گری ہوئی اُمت بھی مطلقاً خالی نہیں ہوتی۔ ایسی قوموں میں طرح طرح کے برخود غلط و خود بین لوگ سیاسی رہنما یا پیشوایانِ دین بن جاتے ہیں۔ عوام میں چونکہ بصیرت کا فقدان ہوتا ہے اس لئے ہر مدعی کو مرید اور پیرو مل جاتے ہیں۔ جو لوگ مخلص اور عقل و اخلاق کے لحاظ سے بلند پایہ ہیں یہ چھوٹے رہبر اُن کو بھی اپنے احاطۂ مریدی میں لانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ عوام پر اس کا رعب قائم ہو کہ دیکھو کیسے کیسے عاقل اور مخلص بھی ان کو امام مانتے ہیں یہ مخلص لوگ اس کا تماشہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ رہبری کا مدعی کس پایہ کا ہے اور کتنے پانی میں ہے۔ معمولی باتوں میں تو اس کی لاف زنی کے ڈھول کا پول نہیں کھلتا لیکن جہاں اہم امور سے واسطہ پڑا وہاں ان رہبروں کی کم مائگی طشت از بام ہو جاتی ہے۔ مولانا نے اس کو ایک عمدہ تمثیل میں بیان کیا ہے کہ ایک اونٹ کی ایک لمبی مہار زمین پر پڑی تھی ایک چوہے نے اس کے سرے کو منہ میں دبا لیا۔ مہار کو کھینچا تو اونٹ ایک خاص سمت کو چلنے لگا چوہے میں بڑا غرّہ پیدا ہوا کہ دیکھو ہماری شہ زوری کہ ایک اونٹ کو کھینچے لئے جاتا ہوں۔ اونٹ بھی سمجھ گیا کہ ان حضرات کو اپنے متعلق دھوکا لگا ہے اچھا ابھی ہم اس کو کچھ نہیں کہتے اس کو مہار کھینچنے دیجئے ہم بھی کچھ چلے چلتے ہیں۔ آگے ایک گہرے پانی کی ندی آگئی چوہا وہاں رُک گیا۔ اونٹ نے کہا جناب شتربان صاحب اٹک کیوں گئے آپ تو ہمارے رہنما ہیں آگے آگے چلئے ہچکچانے کیوں لگے۔ چوہے نے کہا کہ پانی بہت گہرا ہے کہیں میں ڈوب نہ جاؤں۔ اونٹ نے کہا کہ ٹھیرو کہ میں اس میں قدم رکھ کر گہرائی کا اندازہ کر لیتا ہوں۔ اونٹ نے اپنی ٹانگ پانی میں ڈال کر کہا، کہ حضرتِ موش گھبرائیے نہیں پانی تا بزانو ہے ڈوبنے کا کوئی خطرہ نہیں۔ چوہے نے کہا کہ تا بزانو تو آپ کے لئے ہے مجھ جیسے بڈّی کے لئے تو سو گز سمجھنا چاہیئے :

چو آب رو سر گذشت | چہ یک نیزہ چہ یک دست

اونٹ نے کہا کہ اب آپ کو اپنی حقیقت معلوم ہوگئی بہت شہ زوری اور رہبری کا دعوےٰ فرما رہے تھے۔ چوہے نے کہا میری توبہ اب ایسی گستاخی پھر کسی بزرگ سے نہ کروں گا۔ اونٹ نے اس کو معاف کر دیا اور اس پر رحم کھا کر اس کو اپنے کوہان پر بٹھا لیا تجھ جیسے سینکڑوں رہبروں اور اماموں کو تو میرے جیسا مقتدی اپنی پیٹھ پر بٹھا کر پار کر سکتا ہے۔ اس قسم کے پیشوایانِ دین اور مدعیانِ رہبریٔ ملّت کو مولانا تنبیہ کرتے ہیں کہ بصیرت اور اخلاق میں کم مائگی کے ساتھ رہبری کی کوشش

نہ فرمائیے :

چوں پیمبر نیستی، پس رو براہ　　تا رسی از چاہ روزے سوئے جاہ
تو رعیت باش چوں سلطاں نۂ　　تنگ مراں چوں مرا کشتیباں نۂ
چونکہ آزادیت نامد بندہ باش　　مس میوش اطلس برو در ژندہ باش

---

فرماتے ہیں کہ یہ ذوقِ رہبری والے لوگ جو کبھی مصلحِ ملّت اور کبھی مصلحِ عالم اور کبھی مجدّدِ وقت اور کبھی نجات دہندۂ قوم ہونے کے دعوے کرتے ہیں ان میں سے اکثر کو یہ مرض ذوقِ اقتدار اور شوقِ اشتہار زہر کی طرح ان کے قلب میں سرایت کر جاتا ہے کہیں کہیں کوئی مردِ خدا ایسا پیدا ہوتا ہے جس کو سروری زیبا ہو اور جسے اقتدار بدمست نہ کر سکے ایسے برگزیدہ رہبروں کے دل میں ابتدا ہی سے اس زہر کا تریاق موجود ہوتا ہے۔ ایک انگریز مفکّر کا قول مشہور ہے کہ اقتدار ہمیشہ فسادِ قلب کا باعث ہوتا ہے اور اقتدارِ مطلق فسادِ مطلق ہے :

سروری زہر است جز آں روح را　　کہ بود تریاقِ لانی ز ابتدا

جہاں آمرِ مطلق سے کسی نے اختلافِ رائے کا اظہار کیا وہیں وہ اس کا دشمن ہوا اس کے دماغ میں انا الحق اور انا الموجود ولا غیری کا ڈنکا بج رہا ہوتا ہے۔ ایسا رہبر اختلافِ رائے کو برداشت کرنے اور دوسروں کی رائے کو منصفانہ طور پر ٹھنڈے دل سے سوچنے کی صلاحیت کھو چکتا ہے۔ اختلاف کرنے والے کے متعلق اس کے دل میں یہ گمان اُبھرتا ہے کہ یہ ہماری لیڈری کو نہیں مانتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری جگہ یہ خود لیڈر بننا چاہتا ہے اس کی ابھی سے سرکوبی کرنی چاہئے۔ ادنیٰ سیرت کا شخص رہبر بن کر کبر و نخوت کی پوٹ بن جاتا ہے۔ نفسانی خواہش غرور پیدا کرتی ہے اور پھر یہ عادت راسخ ہو جاتی ہے۔ خدا اقتدار طلبی سے بچائے جس کی وجہ سے ابلیس پیمبرانہ لہجہ اختیار کر لیتا ہے :

ابتدائے کبر و کیں از شہوت است　　راسخیٔ شہوتت از عادت است
چوں ز عادت گشتہ محکم خوئے بد　　خشم آید بر کسے کت واکشد